شیروں کی رانی

سلسلۂ مطبوعات ۱۳۳ مکتبہ الحسنات، دہلی

شیروں کی رانی

کہانیوں کا مجموعہ

رئیس صدیقی
ایم۔ اے بی ایڈ ڈپلوما ان ماس میڈیا
لندن

مکتبہ الحسنات (دہلی)

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

SHERON KI RANI
RAIS SIDDIQUI
Rs. 3.00 1984

پہلی بار ——— ۱۹۸۴ء ——— ۲۰۰۰

ناشر
مکتبہ الحسنات (دہلی)
۲۲۴۱- کوچہ چیلان، دریا گنج
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مطبوعہ
نازیہ پرنٹرس رودگراں دہلی

قیمت
۳/-

کہانیاں

شیروں کی رانی	۵
آب	۱۲
تلاش	۱۹
تین سوال	۲۳
موت کے لمبے ہاتھ	۳۰
قدرت کا انتقام	۳۳
ٹھوکر	۳۸
لال پانی	۴۱
نافرمانی کا نتیجہ	۴۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شیروں کی رانی

شاہین اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اسے بچپن ہی سے جانوروں سے بے حد لگاؤ تھا۔ وہ اکثر اپنے باپ کے ساتھ شکار پر جایا کرتی تھی۔ مگر جب وہ تیرہ سال کی ہوئی تو اس کے باپ ایک روز اچانک دل کا دورہ پڑنے سے مر گئے۔ اب گھر میں وہ تھی اور اس کی ماں۔ گزارے کا کوئی معقول ذریعہ نہ تھا۔ پس خدا کی مہربانی سے دن جوں توں گزر رہے تھے۔

ایک بار شہر میں ایک مشہور سرکس آیا۔ شاہین کو سرکس دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ مگر پیسے نہ ہونے کی وجہ سے وہ روزانہ سرکس کے باہر لگی ہوئی تصویروں کو دیکھ کر مایوس اپنے گھر لوٹ آتی تھی۔

ایک دن شاہین روزانہ کی طرح سرکس کے باہر لگی ہوئی جانوروں کی تصویریں دیکھ رہی تھی کہ اندر سے اُسے ہاتھیوں کے چنگھاڑنے اور شیروں کے دہاڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ ہاتھیوں اور شیروں کی آوازیں سن کر بے تاب ہو گئی اور اس نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ آج میں سرکس دیکھ کر ہی رہوں گی۔

سب ہی چھوٹے بڑے ٹکٹ خرید کر پنڈال میں داخل ہو رہے تھے۔ اسی قطار میں شاہین بھی لگ گئی۔ ٹکٹ کے بغیر ہی اس نے بھیڑ کے ساتھ گھسنے کی کوشش کی۔ مگر ایک بھاری آواز نے اُسے روک دیا۔ اے لڑکی! تمہارا ٹکٹ؟

میرے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔ شاہین نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

یہ جواب سنتے ہی ٹکٹ چیکر نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لیکن شاہین نے ایک زوردار جھٹکا دیا کہ اس کا ہاتھ خود بخود ڈھیلا پڑ گیا۔

اِتنے میں ایک لحیم شحیم آدمی جو یہ سب کچھ دور کھڑا دیکھ رہا تھا، آکر بولا:

بے بی! میرا نام ذاکر ہے۔ میں شیروں کا ماسٹر ہوں۔ کیا بات تھی جو اس نے تمہارا ہاتھ پکڑ لیا تھا؟

جی۔ وہ شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔ انکل! مجھے جنگلی جانور بہت اچھے لگتے ہیں اور میں۔۔۔۔

لیکن تم نے ٹکٹ کے بغیر کیوں داخل ہونے کی کوشش کی؟ یہ تو بہت غیر اخلاقی بات ہے۔ اگر تم بغیر ٹکٹ سرکس دیکھنے میں کامیاب بھی ہو جاتیں تو کیا خدا کے یہاں منھ دکھانے کے لائق رہتیں؟

میں شرمندہ ہوں۔ کیا کروں۔ جانوروں کی آوازیں سن کر میرا دل بے قابو ہو گیا۔ میرے شوق نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ میں بے حد شرمندہ ہوں۔ اَب آئندہ ایسی غلطی نہیں ہو گی۔ مجھے معاف کر دیجئے۔

وہ معافی مانگ کر آگے بڑھی تھی کہ دارا نے لپک کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور بڑی نرمی سے بولا:

بے بی رکو۔ میں تمہارے شوق سے بہت خوش ہوں۔ مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ تمہیں بھی میری طرح جانوروں سے بہت لگاؤ ہے۔

اچھا آؤ۔ میں تمہیں منیجر سے پاس دلا دوں۔

دارا نے مجھکو داخلہ کا پاس دلایا اور یہ کہتے ہوئے شیروں کے کٹہرے کی طرف چل دیا۔ آؤ میں تمہیں اپنے دوستوں سے ملواؤں۔

دارا شاہین کو شیروں کے پنجرے کے پاس لے گیا اور شیروں سے بڑے پیار سے مخاطب ہوا۔ شیروں نے بھی اپنے اپنے مخصوص انداز میں میں جواب دیا۔

شاہین شیروں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی کہ دارا نے اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے کہا۔ تم ان شیروں کی اُستاد بن سکتی ہو۔ اگر تم چاہو تو۔

میں؟ شاہین پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

ہاں ہاں تم۔ دارا نے اُسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ان شیروں کے لئے جتنی محبت، ہمت اور اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے، وہ تم میں موجود ہے۔ بولو۔ سیکھو گی یہ کام؟

یہ سُن کر شاہین پھولی نہ سمائی۔ وہ فوراً بولی۔ انکل! آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔ میں بالکل تیار ہوں۔

دارا اس کے دلیرانہ جواب سے بہت خوش ہوا اور اس کی پیٹھ

تھپتھپاتے ہوئے بولا ــــ اچھا آج تم سرکس دیکھو۔ کل گیارہ بجے اپنے کسی سرپرست کو لے کر میرے پاس آجانا۔

دوسرے دن شاہین اپنی ماں کو لے کر دارا کے پاس آئی۔ دارا نے اس کی ماں سے کنٹریکٹ فارم پر دستخط کرالئے۔ اور شاہین کو شیروں کے پنجرے کے پاس لے گیا۔ پھر اس نے اس سے پوچھا ــــ روزانہ کی طرح آج بھی ریہرسل ہونے والی ہے۔ کیا تم تیار ہو؟

جی ہاں۔ میں بالکل تیار ہوں ــــ شاہین نے اعتماد بھرے لہجہ میں جواب دیا۔

دارا شاہین کو ڈریس روم لے گیا اور بولا؛ یہ لو کپڑے۔ انھیں پہن کر جلدی سے باہر آؤ۔

شاہین نے جلدی سے کپڑے تبدیل کئے اور باہر آگئی ــــ دارا نے اسے ایک ہنٹر تھماتے ہوئے چند ضروری باتیں بتائیں۔

بے بی! شیروں کے درمیان جانے سے پہلے چند باتیں اچھی طرح یاد کرلو۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہر شیر تم سے نظریں ملائے گا ــــ اگر وہ ذرا سا بھی بھانپ گیا کہ تم ڈر رہی ہو یا تم باتیں اس سے کر رہی ہو لیکن دیکھ کسی اور طرف رہی ہو تو وہ تم پر ٹوٹ پڑنے میں قطعی دیر نہیں کرے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ تم اس بات کا بھی اندازہ لگالینا کہ وہ تم سے خوش ہے یا نہیں۔

دارا نے یہ باتیں بتانے کے بعد لوہے کی چھڑوں سے بنے ہوئے

پنجرے کا دروازہ کھلوایا اور شاہین کے ساتھ اس کے اندر داخل ہوگیا۔

دروازہ کھلتے ہی پانچوں شیر شیرنی اپنی لال لال چوکیوں پر چھلانگ لگا لگا کر جا بیٹھے۔

دارا سب سے پہلے موتی سے مخاطب ہوا۔ موتی نے غرا کر ظاہر کیا کہ وہ خوش ہے۔ پھر دارا نے شاہین کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

بے بی! اس کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھو۔ لیکن دھیان رکھنا کہ یہ پنجہ تو نہیں اٹھا رہا ہے۔ اگر ایسا محسوس کرنا تو فوراً اپنے ہنٹر کی موٹھ اس کی ناک پر جما دینا۔ کیونکہ شیروں کی ناک بہت نازک ہوتی ہے۔ اور اس طرح وہ جلد ہی قابو میں آجاتا ہے۔

اس کے بعد ہیرا، جواہر اور راجہ سے شاہین کو ملوایا گیا۔ ان سب نے اس کی دوستی قبول کرلی لیکن پانچویں شیرنی جس کی طرف شاہین نے ذرا کم توجہ دی تھی، اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور دھول اڑاتی ہوئی شاہین کی طرف جھپٹی۔

یہ دیکھنا تھا کہ دارا نے گرج کر کہا " رانی! رک جا" اس آواز کو سن کر رانی وہیں رک گئی۔ اس کا پنجہ، جو اس نے اٹھایا تھا، مارے غصہ کے کانپ رہا تھا۔ دارا نے آہستہ سے شاہین سے کہا۔ رانی گھبرا گئی۔ خطرہ ٹل گیا۔

دارا نے پھر شاہین کے چہرے کا جائزہ لیا۔ لیکن اس کے چہرے پر خوف کے ذرا سے بھی آثار نہ تھے۔ اس نے رانی سے لڑنے کے لئے ہاتھ میں ہنٹر سنبھال لیا تھا۔ دارا اس کی بہادری دیکھ کر بولا:

" اگر خدا نے چاہا تو تم اگلے ہی مہینے ان سب کی ماسٹر بن جاؤ گی اور اِن کے بیچ آکر تماشہ دکھانے لگو گی۔"

دارا کی بات صحیح ثابت ہوئی۔ اگلے ہی مہینے سے شاہین شیروں کے درمیان آکر تماشہ دکھانے لگی اور سب سے حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ حملہ آور رانی اَب اس کی گہری دوست بن گئی تھی۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ راجہ اس پر جھپٹا تو رانی نے اپنی دوست کی حفاظت کرتے ہوئے جواباً اچھل کر اس کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا۔

مہینے کی پہلی تاریخ کو دس دس کے نوٹوں کی ایک گڈی شاہین کو دیتے ہوئے دارا بولا:

تمہیں روزانہ ایک بار موت کے منہ میں جانا پڑتا ہے۔ اس کے عوض میں یہ روپے بہت کم ہیں۔ لیکن جلدی ہی تمہاری تنخواہ بڑھا دی جائے گی۔ تمہارے کام سے سب ہی لوگ خوش ہیں۔

شاہین نے دارا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نوٹوں کی گڈی لی اور اپنی ماں کے پاس آئی۔ اس نے اپنی ماں کی بوڑھی ہتھیلی پر روپیوں کی گڈی رکھتے ہوئے کہا۔" ماں یہ لو میری پہلی تنخواہ۔"

ماں کی بوڑھی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ بولی۔

بیٹی! تو نے جو خطرناک کام اپنے ذِمّے لے رکھا ہے۔ اس سے میں رات دن خوف کے مارے کانپتی رہتی ہوں۔ اور ہر وقت دعا کرتی رہتی ہوں

کہ تو ہمیشہ صحیح سلامت رہے۔

ماں! شاہین نے بات کاٹتے ہوئے اپنی ماں کو تسلی دی ۔ ماں تم گھبرایا نہ کرو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے روزانہ کچھ گھنٹے موت کے سائے میں گزارنے پڑتے ہیں۔ لیکن یہ موت کے سائے انسانی سائے کے مقابلے میں زیادہ خطرناک نہیں ہیں۔ یہ جنگلی اور خونخوار جانور انسان کے مقابلے میں کہیں زیادہ نیک اور وفادار ہوتے ہیں۔ یہ للکارتے ہیں چھپ کر کسی پر وار نہیں کرتے۔ یہ غرّا کر ڈراتے ضرور ہیں لیکن اپنے فائدے کے لئے کسی کی زندگی سے نہیں کھیلتے۔

اور ماں۔ یہ تم نے ہی تو بتایا تھا کہ موت اور زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس دنیا میں بہادری اور شان سے جینا چاہیئے۔ پھر ہم موت سے کیوں ڈریں اگر ڈرنا ہی ہے تو اپنے خدا سے ڈریں جو ہم سب کا مالک ہے!!!

✣ ✣ ✣

اَب

روسی کہانی

ایک بار کا واقعہ ہے کہ ایک بادشاہ کے دل میں یہ خیال آیا کہ کاش اگر مجھے یہ معلوم ہو جایا کرے کہ

صحیح کام کرنے کا صحیح وقت کیا ہے؟

وہ کون لوگ ہیں جن کی مجھے بہت سخت ضرورت ہے؟؟

اور وہ کون سے معاملات ہیں جو بہت اہم اور ضروری ہیں؟؟

تو کتنا اچھا ہوتا۔ دل میں یہ خیال آتے ہی بادشاہ نے اپنی پوری سلطنت میں اعلان کروادیا کہ جو شخص بادشاہ کے ان تین سوالوں کے اطمینان بخش جواب دے گا، اُس کو انعام و اکرام سے مالا مال کردیا جائے گا۔

سلطنت کے بڑے بڑے عالم، فاضل، شاعر، ادیب، فلسفی اور عقلمند لوگ بادشاہ کی خدمت میں اپنے اپنے جواب لے کر حاضر ہوتے لیکن کوئی بھی شخص بادشاہ کو اپنے جوابات سے مطمئن نہ کرسکا۔

آخرکار بادشاہ نے طے کیا کہ وہ اُس بزرگ درویش کی خدمت میں حاضری دے گا جو کہ ایک دور سنسان جنگل رہتا ہے اور صرف عام آدمیوں ہی سے ملاقات کرتا ہے۔

بادشاہ نے اس درویش سے ملاقات کرنے کی غرض سے معمولی کپڑے پہنے اور اُس کی جھونپڑی سے کچھ دور پہلے ہی اپنے گھوڑے سے اُتر پڑا۔ پھر اپنے سپاہیوں کو وہیں چھوڑ کر درویش سے ملنے کے لئے اکیلے چل پڑا۔

جب بادشاہ جھونپڑی کے قریب پہنچا تو اُس وقت وہ درویش اپنی جھونپڑی کے سامنے پڑی ہوئی زمین کو کھود رہا تھا۔

بادشاہ نے سلام کرنے کے بعد درویش کی خدمت میں ادب سے عرض کیا۔

اے بزرگ درویش! میں آپ کے پاس تین سوالوں کے جواب لینے آیا ہوں وہ ہیں کہ

صحیح کام کرنے کا صحیح وقت کیا ہے؟

وہ کون لوگ ہیں جن کی مجھے بہت سخت ضرورت ہے؟؟ تاکہ میں دوسروں کے مقابلہ میں اُن لوگوں پر زیادہ توجہ کرسکوں۔

اور وہ کون سے معاملات ہیں جو بہت اہم اور ضروری ہیں؟ تاکہ میں اُن پر فوری توجہ دے سکوں۔

درویش نے بادشاہ کے تینوں سوال بہت غور سے سُنے۔ لیکن کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اُس نے اپنی ہتھیلیوں کو تھوک سے نرما کر پھر زمین گوڑنا

شروع کر دی۔

آپ تھک گئے ہوں گے۔ لائیے پھاوڑا مجھے دے دیجئے۔ تھوڑی دیر میں آپ کا کام کر دوں ـــــ بادشاہ نے درویش سے پھاوڑا لیتے ہوئے کہا۔

شکریہ! ـــــ درویش نے کہا ـــ اور پھر پھاوڑا بادشاہ کو دے کر ستانے کے لئے زمین پر بیٹھ گیا۔

جب بادشاہ دو کیاریاں گوڑ چکا تو اس نے پھر اپنے سوال دُہرائے لیکن درویش خاموش رہا اور اُٹھ کر بادشاہ سے پھاوڑا لینے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولا:

اب تم دَم بھر آرام کر لو۔ اور مجھے کام کرنے دو۔

لیکن بادشاہ نے اس کو پھاوڑا نہیں دیا اور وہ زمین کھودتا رہا۔

اسی طرح وقت گذرتا گیا اور دھیرے دھیرے شام ہو گئی۔

آخر کار بادشاہ نے زمین پر آخری پھاوڑا مارتے ہوئے کہا:

بزرگ درویش! میں آپ کے پاس اپنے تین سوالوں کے جواب لینے آیا ہوں۔ اگر آپ میرے سوالوں کے جواب نہیں دے سکتے ہیں تو بتا دیجئے تاکہ میں اپنے گھر لوٹ جاؤں۔

اس بزرگ نے جواب دینے کے بجائے پتیوں کی کھڑکھڑاہٹ سُن کر پیچھے مڑ کر دیکھا اور بولا:

وہ دیکھو! کوئی آدمی ادھر ہی بھاگا ہوا آ رہا ہے۔ آؤ دیکھیں وہ کون

ہے؟

بادشاہ گھوما۔ اس نے داڑھی والے ایک آدمی کو جنگل سے جھوپڑی کی طرف بھاگ کر آتے ہوئے دیکھا۔

وہ شخص اپنے ہاتھوں سے اپنا پیٹ دبائے ہوئے تھا اور خون اس کے ہاتھوں کے نیچے سے بہہ رہا تھا۔

اب وہ جھوپڑی کے کافی قریب آ چکا تھا۔ آخر وہ کراہتا ہوا بادشاہ کے پاس آیا اور زمین پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

بادشاہ اور درویش نے اُس آدمی کے زخم سے کپڑا ہٹا کر دیکھا تو اُس کے پیٹ میں ایک بڑا سا گھاؤ تھا۔

بادشاہ نے جہاں تک ہو سکا اس کے زخم کو اچھی طرح دھویا اور اس پر اپنے رومال سے پٹی باندھی ـــ بڑی مشکل سے اُس کا خون رُکا۔

سورج ڈوب چکا تھا۔ ٹھنڈ بھی بڑھ چلی تھی۔ اس لئے بادشاہ نے درویش کی مدد سے زخمی کو جھوپڑے کے اندر پہنچایا اور چارپائی پر لٹا دیا۔ کچھ دیر کے بعد زخمی سو گیا۔

بادشاہ بھی دن بھر کی دوڑ دھوپ اور کام کی وجہ سے اتنا تھک گیا تھا کہ وہ دہلیز پر ہی پڑ کر سو رہا۔

جب صبح بادشاہ کی آنکھ کھلی تو اس کو بڑی دیر تک یہی یاد نہ رہا کہ وہ کہاں ہے؟ ـــــ اور وہ داڑھی والا آدمی، جو چارپائی پر پڑا ہوا ہے، اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے ٹکٹکی باندھے اسے کیوں دیکھ رہا

ہے ___؟

مجھے معاف کر دیجئے ___ اُس داڑھی والے آدمی نے بادشاہ کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

میں تم کو نہیں جانتا ہوں ___ اور جب تم کو جانتا نہیں ہوں تو معاف کرنے یا نہ کرنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا ہے ___ بادشاہ نے جواباً کہا:۔

میں آپ کا دشمن ہوں۔ آپ نے میرے بھائی کو قتل کر دیا تھا اور اُس کی جائداد ضبط کر لی تھی۔ اسی وقت میں نے انتقاماً عہد کیا تھا کہ میں آپ کو قتل کر دوں گا۔

آج جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ درویش سے اکیلے ملنے گئے ہیں تو میں نے سوچ لیا کہ آپ جب واپس لوٹیں گے تو میں آپ کو راستے میں قتل کر دوں گا۔

لیکن دن گذر گیا۔ آپ واپس نہیں لوٹے تو میں آپ کا پتہ لگانے کے لئے اپنی کمین گاہ سے باہر آیا۔ وہاں آپ کے حفاظتی دستے کے سپاہیوں سے مڈبھیڑ ہو گئی اور میں زخمی ہو گیا۔

میں اُن سے تو بچ نکلا۔ اگر آپ میرے زخموں پر پٹی نہ باندھتے تو میں خون نکل جانے سے مر جاتا۔

میں نے آپ کو قتل کرنا چاہا لیکن آپ نے میری جان بچالی۔

اب اگر میں زندہ رہا تو ساری زندگی آپ کی خدمت کروں گا۔ مجھے

معاف کر دیجئے۔

بادشاہ دشمن سے اتنی آسانی سے صلح کر کے اور اُسے دوست بنا کر بہت خوش ہوا۔ اس نے اس کو معاف ہی نہیں کیا بلکہ اُس سے کہا:

میں اپنے خادموں اور شاہی حکیم کو تمہاری دیکھ بھال اور علاج کے لئے بھیجوں گا اور تمہاری جائیداد بھی واپس کر دوں گا۔

پھر بادشاہ اُس زخمی سے رُخصت ہو کر جھونپڑی سے باہر آیا اور اس نے درویش سے اپنے سوالوں کے جواب پانے کی آخری کوشش کی۔

درویش اپنے گھٹنوں کے بل جھکا ہوا ان کیاریوں میں بوائی کر رہا تھا جو ابھی کل ہی کھودی اور تیار کی گئی تھیں۔

بادشاہ درویش کے پاس پہنچا اور بولا:

بزرگوار! میں آپ سے اپنے سوالوں کے جواب کی ایک بار پھر درخواست کرتا ہوں۔

تم جواب پا چکے ہو ___ لیکن شاید تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔ خیر میں بتاتا ہوں:

سنو! اگر تم نے کل میری کمزوری پر ترس کھا کر ان کیاریوں کو میرے لئے کھودنا شروع نہ کیا ہوتا اور چلے گئے ہوتے تو وہ آدمی تم پر حملہ کر دیتا۔

اس لئے وہ وقت بہت اہم تھا جب تم کیاریاں گوڑ رہے تھے اور اُس وقت میرے ساتھ نیکی کرنا تمہارا سب سے اہم کام تھا۔

اس کے بعد جب وہ زخمی آدمی بھاگ کر ہم لوگوں کے پاس آیا تو وہ

بھی بڑا اہم وقت تھا۔ اگر اس وقت تم اس کے زخموں پر پٹی نہ باندھتے تو وہ تم سے صلح کئے بغیر مر جاتا۔ اس لئے وہ بہت اہم آدمی تھا اور جو کچھ تم نے اُس کے ساتھ کیا وہ اُس وقت کا سب سے اہم اور ضروری کام تھا۔

یاد رکھو۔ ایک ہی وقت اہم ہے اور وہ ہے "اب!" — اس لئے کہ یہی وہ وقت ہے جب ہمیں کوئی کام کرنے کی کچھ طاقت حاصل رہتی ہے۔

سب سے اہم آدمی وہ ہے جس کے ساتھ تم ہو اس لئے کہ کسی کو نہیں معلوم کہ پھر کبھی اُس سے ملاقات ہوگی یا نہیں۔

اور سب سے اہم کام یہ ہے کہ ہر آدمی کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے! —

تلاش

بھارتی جاتک کہانی

یہ اُس وقت کی بات ہے جب میں ایک مدرسہ میں رہ کر تعلیم حاصل کر رہا تھا کہ ایک دن بڑے مولوی صاحب نے ہم سب طالبعلموں کو بلایا اور کہا:۔

"میرے عزیز شاگردو! میں نے تم سب کو یہاں ایک خاص مقصد کے لئے بلایا ہے۔ میرے سامنے ایک مسئلہ ہے۔ میری بیٹی شادی کے لائق ہوگئی ہے۔ لیکن اس کی شادی کرنے کے لئے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کیا کروں؟

اس پر کچھ طالب علم، جن کے والدین امیر تھے، آگے بڑھے اور ادب سے بولے:۔

مولوی صاحب! ہم اپنے ماں باپ سے پیسے مانگ لائیں گے۔ آپ انھیں نذرانہ سمجھ کر قبول کر لیجئے گا۔

نہیں ! قطعی نہیں ! اگر تم پیسے مانگ کر لاؤ گے تو تمہارے ماں باپ سوچیں گے کہ میں لالچی ہوں ۔ اور میں اپنی بیٹی کی شادی شاگردوں سے مانگے ہوئے پیسوں سے کرنا چاہتا ہوں ۔

بڑے مولوی صاحب نے امیر شاگردوں کے مشورہ کو نامنظور کرتے ہوئے کہا اور پھر سوچ میں ڈوب گئے ۔ پھر کچھ دیر بعد مولوی صاحب بولے :۔

ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے ۔ تم لوگ پیسے لاؤ ۔ لیکن مانگ کر نہیں ۔ بلکہ کچھ اس طرح لاؤ کہ کسی کو پتہ نہ چلے ۔ اس طرح میرا کام بھی ہو جائے گا ۔ اور میری لاج بھی رہ جائے گی ۔

سبھی امیر شاگرد اس بات پر رضامند ہو گئے ۔ پھر مولوی صاحب ہم جیسے غریب طالب علموں سے بولے :۔

تم لوگ بھی اپنے اپنے گھروں سے کچھ نہ کچھ لیتے آنا ۔ لیکن خیال رہے کہ کسی کی بھی اُس پر نظر نہ پڑے ۔ ورنہ میں لوں گا نہیں ۔

سبھی شاگردوں نے یقین دلایا کہ ہم جو کچھ بھی لائیں گے ، آپ کی ہدایت کے مطابق لائیں گے ۔

دوسرے ہی دن سے طرح طرح کا سامان آنے لگا ۔ جسے بڑے مولوی صاحب خوشی سے قبول کرتے رہے ۔

کچھ دنوں بعد بڑے مولوی صاحب کے پاس اپنی بیٹی کی شادی

کے لئے کافی سامان اکٹھا ہو گیا ۔

لیکن تمام طالب علموں میں صرف میں ہی ایک ایسا طالب علم تھا جو ابھی تک کچھ نہیں لا سکا تھا ۔

ایک دن بڑی مولوی صاحب نے تعجب ظاہر کرتے ہوئے مجھ سے کہا ۔

رئیس ! تم کچھ نہیں لائے ؟ کیا تم بالکل ہی مفلس ہو ! کچھ تو لانا ہی چاہیئے تھا ۔

میں نے جواباً بڑی نرمی سے عرض کیا :

میرے گھر میں خدا کی مہربانی سے کسی بھی جائز اور ضروری چیز کی کمی نہیں ہے لیکن پھر بھی میں کچھ نہیں لا سکا اور نہ لا سکوں گا ۔

کیوں ؟ کیا تم اپنے استاد کی خدمت نہیں کرنا چاہتے ہو ؟ بڑے مولوی صاحب نے تیور بدلے ۔

نہیں مولوی صاحب ! یہ بات نہیں ہے ۔ بات یہ ہے کہ آپ نے کہا تھا کہ ایسی چیز لانا جسے لاتے وقت کسی نے دیکھا نہ ہو ۔

میں نے بہت کوشش کی ۔ لیکن گھر میں کوئی بھی ایسی جگہ نہ ملی جہاں کوئی دیکھ نہ رہا ہو ـــــ میں نے تحفہ نہ پیش کر سکنے کی وجہ بتائی ۔

تم جھوٹ بول رہے ہو ۔ کبھی نہ کبھی تو ایسا موقع ملا ہی ہو گا جب تم کچھ نہ کچھ لا سکتے تھے ـــــ بڑے مولوی صاحب نے میری بات پر یقین نہیں کیا ۔

مولوی صاحب ! آپ بجا فرما رہے ہیں ۔ لیکن کوئی دیکھے نہ دیکھے میرا

ضمیر تو دیکھ رہا تھا۔ ہم سب کا خدا تو دیکھتا رہتا ہے۔ پس اسی خوف سے میں کچھ نہیں لا سکا ـــــ میرے منہ سے بڑی مشکل سے یہ الفاظ ادا ہوئے ـــــ

ابھی میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ بڑے مولوی صاحب نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے گلے لگا لیا۔ اور سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

پس تو ہی میرا سچا شاگرد ہے۔ میرے کہنے پر بھی تم نے بُرا راستہ نہیں اپنایا۔ یہ تمہارے کردار اور دل و دماغ کی پاکیزگی ہے۔ اور یہی میری تعلیم کا مقصد ہے۔

بیٹے! مجھے اپنی بیٹی کی شادی کے لئے دولت کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے تو ایک ایسے لڑکے کی "تلاش" تھی جو سنجیدگی، سمجھداری، مستقل مزاجی، اچھے بُرے کی تمیز کی صلاحیت اور پاکیزگی کی دولت سے مالا مال ہو۔ مجھے ایسے لڑکے کی تلاش تھی جو اپنے ضمیر، اپنے خدا سے ڈرتا ہو۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھے جس دولت کی تلاش تھی، آج وہ مل گئی!

تین سوال

انگریزی کہانی

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب انگلینڈ پر جان نام کے ایک بادشاہ کی حکومت تھی۔

وہ بہت بدمزاج، بدکردار، تنگ دل، ظالم اور حاسد بادشاہ تھا۔ وہ اپنی رعایا میں جب کبھی کسی کو ذرا بھی ہر دل عزیز اور خوش حال دیکھتا تو اس سے حسد کرنے لگتا اور کسی نہ کسی بہانے اس کو تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتا۔

ایک روز جان کے جاسوسوں نے اُسے خبر دی کہ ایک سردار عوام میں روز بروز مقبول ہوتا جا رہا ہے اور اُس کی انصاف پسندی و خدا ترسی کا ہر جگہ چرچا ہے۔

یہ سُننا تھا کہ اُس ظالم نے فرمان جاری کیا کہ

سردار کو مابدولت کے سامنے آج ہی اور اسی وقت پیش کیا

جائے ـــــ

وزیر اعظم نے حکم کی تعمیل کی اور سردار کو اُس کی خدمت میں حاضر کر دیا ـــ

بادشاہ نے سردار سے اپنی گرجدار آواز میں پوچھا:

کیا یہ سچ ہے کہ تم عوام میں مجھ سے زیادہ باعزت اور مقبول ہو؟

کیا یہ سچ ہے کہ تم مجھ سے زیادہ خوش حال ہو؟

اگر ایسا ہے بھی تو کیوں؟

مجھے ایمانداری سے پوری بات بتائی جائے۔ ما بدولت تمہاری طرف سے فکر مند ہیں۔

سردار نے بڑی عاجزی سے جواب دیا:

جہاں پناہ! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بھلا میں آپ سے زیادہ مشہور اور مقبول کیسے ہو سکتا ہوں؟

آپ اس مُلک کے بادشاہ ہیں۔ آقا ہیں۔ مالک ہیں۔ ہر روز آپ ہزاروں لوگوں کو اپنی مہربانیوں سے نوازتے ہیں۔ ظاہر ہے آپ کے مقابلے میں اس حقیر کی کیا بساط! بندہ معافی چاہتے ہوئے عرض کرتا ہے کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

تو گویا جہاں پناہ جھوٹ بول رہے ہیں؟ ـــ جان کی بڑی بڑی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔

اگر جان کی امان پاؤں تو عرض ہے کہ میں نے تو ایسا عرض نہیں کیا'

عالی جاہ! سردار نے بڑے ادب سے کہا۔

نہیں! ـــ تم گستاخ ہی نہیں، بے ادب بھی ہو۔ تم کو سزا ملنی چاہیئے۔

اور جان نے اس بے گناہ کو سزا دینے کا فیصلہ سنا دیا۔

فیصلہ سُن کر سارے دربار میں سناٹا چھا گیا کیونکہ سارے درباری اچھی طرح جانتے تھے کہ سردار بے قصور ہے۔

ایک منجھے لگے درباری نے کورنش بجالاتے ہوئے بڑے ادب و احترام سے بادشاہ کی خدمت میں عرض کرنے کی ہمت کی:

جہاں پناہ! جہاں تک میرا خیال ہے، سردار بالکل بے گناہ ہے۔ یہ تو آپ کا خادم ہے۔

اچھا تم کہتے ہو تو میں اس کو معاف کر دوں گا مگر ایک شرط ہے ـــ یہ میرے تین سوالوں کے جواب دے گا ـــ جان نے تیور بدلتے ہوئے سردار کے سامنے اپنے تین سوال رکھے:

میرا پہلا سوال یہ ہے کہ میری "قیمت" کیا ہے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ میں کتنے دنوں میں گھوڑے پر سوار ہو کر پوری دنیا کا چکّر کاٹ سکتا ہوں؟؟

میرا تیسرا اور آخری سوال یہ ہے کہ میں اِس وقت کیا سوچ رہا ہوں؟؟ ـــ

مرتا کیا نہ کرتا۔ بے چارہ سردار اِن سوالوں کا جواب دینے پر رضامند

ہو گیا۔ لیکن اس نے بادشاہ سے درخواست کی:

عالی جاہ! مجھے اِن سوالوں کا جواب دینے کے لئے چند دن کی مہلت عطا فرمائی جائے۔

بادشاہ نے اس کی درخواست قبول کرتے ہوئے اُسے اپنے فیصلہ سے آگاہ کیا:

میں تمہیں دو ہفتے کی مہلت دیتا ہوں۔ اگر تم نے اتنی مہلت میں میرے سوالوں کے جواب نہ دیئے تو تمہیں پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا۔

ایک ایک کر کے دن گذرتے گئے۔ جب رات پوری ہونے میں صرف دو دن رہ گئے تو سردار نے سوچا کہ

پرسوں میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ کیوں نہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کا آخری دیدار کر لوں۔

چنانچہ وہ لوگوں سے آخری ملاقات کے لئے گھر سے چل دیا۔

راستے میں اُسے ایک چرواہا ملا۔ اُس نے سردار کو سلام کیا۔

وعلیکم کہہ کر سردار آگے بڑھ گیا۔

چرواہے نے سردار کو کبھی ایسی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ لہٰذا اُس کو تشویش ہوئی کہ کیا معاملہ ہے؟ ——— اُس نے سردار سے دریافت کیا:

مالک، کیا بات ہے؟ ——— آج آپ بہت دکھی دکھائی

دیتے ہیں!

نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ سردار نے اُسے مختصر سا جواب دے کر ٹالنے کی کوشش کی۔

لیکن چرواہے نے سارا قصّہ معلوم کر کے ہی دم لیا۔

اور کچھ دیر سوچنے کے بعد اُس نے سردار کے کان میں کچھ کہا جسے سُن کر سردار بہت خوش ہوا اور اپنے گھر واپس آ گیا۔

مقررہ دن آیا۔ سردار بڑے اعتماد سے دربار میں حاضر ہوا۔

لیکن اس نے ایک خاص قسم کی ٹوپی پہن رکھی تھی جس سے اس کا تقریباً پورا چہرہ چھپا ہوا تھا۔

کیا تم میرے تینوں سوالوں کے جواب دینے کے لئے تیار ہو؟ ——— جان نے کڑک کر سوال کیا۔

جی عالی جاہ! یہ غلام حاضر ہے ——— سردار نے جواباً عرض کیا۔

تو بتاؤ میری قیمت کیا ہے؟

جان نے اپنے سوالوں کی ابتدا کی۔

ظلّ سبحانی! ہمارے ملک میں پونڈ سب سے زیادہ قیمتی سکّہ ہے۔ لہٰذا آپ کا مقابلہ اسی سکہ سے ہونا چاہیئے۔

جان یہ سُن کر بہت خوش ہوا۔ اس نے اپنا دوسرا سوال کیا:

میں گھوڑے پر سوار ہو کر کتنی دیر میں پوری دنیا کا چکر لگا سکتا

ہوں ؟ ــــ

سرکار! آپ اگر سورج نکلتے ہی گھوڑے پر سوار ہو کر سورج کی رفتار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھیں تو آپ چوبیس گھنٹے میں پوری دنیا کا چکر لگا سکتے ہیں۔

بہت خوب! بہت خوب! ــــ جان نے بے اختیار داد دی۔

اب میں تم سے اپنا تیسرا اور آخری سوال پوچھتا ہوں۔ ذرا سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ کیونکہ اسی سوال کے جواب پر تمہاری جان بخشی کا دارومدار ہے۔ ہاں تو بتاؤ۔ میں اس وقت کیا سوچ رہا ہوں؟

بادشاہ سلامت! اس وقت آپ سوچ رہے ہیں کہ کیا میں وہی سردار ہوں جسے آپ نے سزا کا حکم سنایا تھا ــــ سردار نے پر اعتماد آواز میں جواب دیا۔

اس پر بادشاہ چونکا اور گھبرا کر بولا:

تو پھر آخر تم کون ہو؟

میرے آقا! میں ایک چرواہا ہوں۔

اس نے اپنے سر سے ٹوپی اتارتے ہوئے کہا۔

اِس انکشاف پر بادشاہ اور سارے درباری حیرت میں پڑ گئے۔ پھر بادشاہ نے لال پیلے ہوتے ہوئے کہا:

تم ــــ سردار کے بدلے کیوں آئے؟

جہاں پناہ! خدا آپ کا سایہ ہم پر ہمیشہ رکھے۔ مجھے اندیشہ تھا کہیں

وہ معصوم اور بے گناہ انسان پھانسی کے تختہ پر نہ چڑھا دیا جائے۔

تو کیا تم کو معاف کر دیا جائے گا! بادشاہ غرایا

عالی جاہ! میں اگر اس دنیا سے چلا جاؤں تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن سردار جیسے خدا ترس ایماندار، انصاف پرست اور نیک نسان کی اس ملک کو بھی بہت سخت ضرورت ہے۔

بادشاہ کی خردبینی، خودستائشی، خودغرضی، غرور اور حیوانیت نے چرواہے کی شکل میں انسانیت کا پاک چہرہ دیکھا جس سے اُس کی روح اور اُس کا ضمیر جاگ اُٹھا۔

اُس نے دونوں کو معاف کر دیا ــــ اور سردار جیسی ہر دل عزیز زندگی اپنانے کا فیصلہ کیا!!!

موت کے لمبے ہاتھ

ہندی تامل لوک کہانی

ایک دن کا ذکر ہے کہ دوپہر کے وقت منجلا ریاست کے راجہ جنک کے پاس اُن کا ایک خادم ہانپتے ہوئے آیا اور ہکلاتے ہوئے بولا:

حضور! ..... ابھی ..... ابھی بازار میں ..... مجھے موت .....

موت کی دیوی ..... دکھائی پڑی ..... وہ ..... وہ مجھے بڑی دیر تک تکتی رہی ..... مجھے ڈر لگ رہا ہے ..... کہ کہیں .....

راجہ جنک نے اس کے کانپتے ہوئے جسم پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور بات کاٹتے ہوئے تسلی دینے کی کوشش کی۔

سنو! موت کی دیوی ظالم نہیں ہوتی۔ وہ بلاوجہ کسی کو نہیں ستاتی۔ اس کے پاس جس کی موت کا پروانہ ہوتا ہے، اسی کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اور یہ کوئی خوف یا ڈر کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ ہر جاندار کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے۔ اور اگر ڈرنا ہی ہے تو خدا سے ڈرو جس نے

سارے جہان بنائے۔

لیکن اُس پر راجہ کے سمجھانے کا قطعی کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کے دل و دماغ پر صرف ایک بات سوار تھی۔ موت!۔ وہ پھٹی پھٹی آواز میں بولا:۔

حضور! آپ کا اقبال بلند ہو۔ آپ میری مدد کیجئے۔ اگر میں یہاں رہوں گا تو موت کی دیوی مجھے اپنے ساتھ ضرور، ضرور لے جائے گی۔ اس لئے میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں کہ آپ اپنے ذاتی اصطبل سے مجھے اپنا سب سے زیادہ تیز دوڑنے والا گھوڑا دے دیجئے۔ تاکہ اس پر سوار ہو کر، میں جلدی سے اجودھیا نگر پہنچ جاؤں۔ اور وہیں ماتا سیتا دیوی کے قدموں میں رہ کر ساری عمر بتا دوں۔

بادشاہ کو اس کی سادگی پر رحم اور بے وقوفی پر غصہ آیا۔ لیکن اس کی خدمات کا لحاظ کرتے ہوئے اُس نے اسے ایک تیز رفتار گھوڑا دے دیا۔ وہ اس پر سوار ہو کر بہت خوش خوش اجودھیا کی طرف چل دیا۔

اچانک اسی وقت راجہ کو اپنے کسی خاص کام سے کہیں جانا پڑا۔ جب وہ اپنا کام پورا کر کے اپنے محل واپس آ رہا تھا تو راستے میں اسے ایک گھر سے رونے پیٹنے کی آوازیں سنائی دیں۔

پھر اس گھر سے اُسے موت کی دیوی نکلتی ہوئی دکھائی دی۔ راجہ

— —

نے اُس دیوی کو روک کر بڑے ادب سے پوچھا:

دیوی! کیا آپ یہ بتانے کی مہربانی کریں گی کہ آج آپ میرے خادم کو بازار میں گھور گھور کر کیوں دیکھ رہی تھیں؟

موت کی دیوی نے وجہ بتاتے ہوئے جواب دیا۔

میں اُسے گھور نہیں رہی تھی۔ بلکہ بہت غور سے دیکھ کر یہ پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ وہی آدمی ہے جس کی آج مجھے روح قبض کرنی ہے۔ یا یہ کوئی اور ہے؟

کیونکہ اس آدمی کا پتہ اجودھیا نگر کے قلعہ کا دروازہ اور وقت شام لکھا ہے۔ اسی لئے شک ہوا کہ کہیں اس آدمی کا پتہ اور وقت لکھنے میں کوئی بھول تو نہیں ہوئی ہے۔ کیونکہ وہ آدمی ابھی تک یہاں موجود تھا۔ اس کا شام تک اجودھیا نگر میں ہونا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

راجہ نے نہایت افسوس بھرے لہجہ میں دیوی کی الجھن سلجھاتے ہوئے کہا:

دیوی! پتہ اور وقت بالکل ٹھیک لکھا ہے۔ کیونکہ وہ تم سے خوف کھا کر میرا سب سے تیز رفتار گھوڑا لے کر اجودھیا نگر بھاگ گیا ہے۔ وہ شام تک وہاں ضرور پہنچ جائے گا اور اس طرح وہ خود اپنے کو موت کے قریب کرے گا۔

سچ ہے موت کے ہاتھ بڑے لمبے ہوتے ہیں۔ ہمیں موت سے نہیں بلکہ زندگی اور موت کے مالک سے ڈرنا چاہیئے۔

✣ ✣ ✣

قدرت کا انتقام

جب میں قریب بارہ سال کا تھا تو اکثر میں نانی جان کے ساتھ لال پور نامی گاؤں میں رہا کرتا تھا۔

نانی جان جنہیں ہم لوگ پیار میں "اماں" کہتے ہیں، مجھے اکثر و بیشتر اپنے ساتھ گاؤں کے بازار لے جاتی تھیں۔

اس بازار سے کچھ ہی دور پہلے ایک کھنڈر تھا جہاں ایک بھکاری بیٹھا بھیک مانگا کرتا تھا۔ ایک دن بازار میں جاتے ہوئے اماں نے بڑے رازدارانہ انداز میں بتایا کہ یہ فقیر ایک زمیندار کا لڑکا ہے۔ وہ کچھ سال پہلے تک بہت بڑا آدمی تھا۔

یہ سُنتا تھا کہ فوراً میں اماں سے سوال کر بیٹھا۔ تو پھر وہ بھکاری کیسے بن گیا؟

اس سوال پر اماں اپنی عادت کے مطابق جھلا اٹھیں اور جھڑکی دار تیور بدلتی ہوئی بولیں۔

تجھے تو بات بتاؤ، پھر بات کی جڑ۔ مجھے صرف اتنا ہی معلوم ہے اور کچھ نہیں۔

چونکہ میں اماں کے غصّہ سے اچھی طرح واقف ہوں، اس لئے فوراً چپ شاہ کا روزہ رکھ لیا۔ لیکن اتنا ضرور تاڑ گیا کہ اماں جانتی ہے سب کچھ ہیں مگر بتانے سے کترا رہی ہیں۔

میں دوسرے ہی دن اس فقیر کے پاس پہنچا اور ذہن میں پلتے ہوئے سوال کا جواب پانے کی کوشش کی ـــــ لیکن نہ جانے کیوں زبان گنگ تھی۔ البتہ نگاہیں اس کے چہرے پر جم گئیں تھیں۔

کیا بات ہے بیٹا؟

کچھ نہیں بابا۔ کوئی بات نہیں ہے۔

نہیں ـــ کوئی بات تو ضرور ہے۔ بولو ـــ کیا بات ہے؟ ـــــ اچھا یہاں آؤ بیٹھ جاؤ۔

اس کے لہجہ میں اس قدر نرمی اور خلوص تھا کہ میری ساری ہچکچاہٹ دور ہوگئی اور میرے قدم خود بخود اس کی طرف بڑھ گئے۔ میں بیٹھتے ہوئے بولا:

"شکریہ، بابا۔ معاف کرنا' بابا ـــ ایک بات ہے ـ ناراض تو نہیں ہوگے؟"

"نہیں بیٹے، میں ناراض نہیں ہوں گا۔ بولو کیا بات ہے؟"

بابا نے ہمت بڑھائی میں نے کہنا شروع کیا۔

"بابا! میری نانی جان کہتی ہیں کہ پہلے آپ بہت مالدار آدمی تھے ـــ لیکن اَب آپ . . . . . ؟"

"ہاں بیٹے، تمہاری نانی جان صحیح کہتی ہیں"۔ فقیر نے ایک سرد آہ بھری اور

ماضی کے جھروکوں میں کھو گیا۔

"بے شک بیٹا، میں ایک شریف اور دولت مند گھرانے کا آدمی ہوں ـــ میرے باپ زمیندار تھے۔ زمینداری تو ان کے جیتے جی ختم ہو چکی تھی لیکن دولت کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔

باپ نے اپنے مرنے سے پہلے ہی میری شادی ایک زمیندار کی لڑکی سے کر دی تھی۔ ایک دِن جب میرے باپ اپنی زندگی کی آخری سانسیں گِن رہے تھے تو انھوں نے مجھے بڑی محبت سے اپنے پاس بلا کر بٹھایا اور تجوری کی چابیاں دیتے ہوئے تمام جائیداد کے کاغذات میرے سپرد کر دیئے۔ کچھ نصیحتیں کیں۔ کچھ وعدے لئے۔ اور اس رنگ برنگی دنیا سے کوچ کر گئے۔

ان کی موت کے بعد کچھ دنوں تک تو میں انسانوں کی طرح جیتا رہا۔ پھر جانور بن گیا۔ جانوروں سے بھی بدتر۔

میں نے سوتیلے بھائی کو دوسرے گاؤں کے بدمعاشوں سے مروا ڈالا اور دولت کے نشے میں بدمست ہاتھی کی طرح گاؤں کے غریب کسانوں اور مزدوروں کو روندنے لگا۔

کسی کو ذرا سی بات پر گھر سے باہر پھکوا دیا۔ کسی کے ہاتھ پیر تڑوا دیئے۔ کسی کو پیڑ سے بندھوا دیا۔ کسی کے کوڑے لگائے۔ کسی کے مکان میں آگ لگوا دی۔ کسی کے کھیت روندوا دیئے۔ اور نہ جانے کیا کیا، کیا ـــ پس اسی طرح میرے دِن رات ظلم کے سیاہ سائے میں گزرتے رہے۔

لیکن جب میری عمر لگ بھگ تیس ۳۰ برس کی ہوگئی تو تقدیر نے ایسی ٹھوکر ماری کہ میری زندگی حادثوں کی زنجیر سے جکڑ کر رہ گئی۔

سب سے پہلا حادثہ اُن دنوں پیش آیا جب میں ایک مقدمہ کے سلسلے میں کانپور گیا ہوا تھا اور وہاں دو دِن رُکا رہا۔

اُن دنوں موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ جس روز میں کانپور پہنچا اسی رات یہاں بارش اتنی زور سے ہوئی کہ بہت سے مکان گر گئے اور بہت سے بچے، جوان، بوڑھے مر گئے۔ بہت سے زخمی ہو گئے۔

میرا مکان بھی ڈھے گیا۔ گاؤں والوں کو حیرت تھی کہ پکّی اینٹوں کا اتنا مضبوط مکان اتنی بری طرح کیسے ڈھے گیا۔

میں جانتا ہوں وہ کیوں ڈھے گیا سچ تو یہ ہے کہ وہ میرے گناہوں کا بار نہیں سنبھال سکا۔

اتنا ہی نہیں، میری بے قصور بیوی بھی اسی میں دب کر مر گئی۔

جب میں کانپور سے واپس آیا تو میرے گناہوں کی سزا میرے سامنے تھی۔

اس حادثہ کے قریب ایک مہینے بعد مقدمہ کی پیشی میں پھر مجھے کانپور جانا پڑا۔ جس بس میں میں سوار تھا، وہ بارہ دیوی مندر کے پاس اُلٹ گئی اور میری دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔

دوا علاج میں میرا بچا کچا سارا پیسہ خرچ ہو گیا لیکن میری ٹانگیں ٹھیک نہیں ہوئیں۔ زہر پھیلتا گیا اور مرض لاعلاج ہوتا گیا ــــ آخر کار ٹانگیں کاٹ

دی گئیں اور میں اپاہج ہو گیا۔

یہ سزا میرے لئے پہلی سزا سے بھی زیادہ سخت اور جان لیوا تھی۔ یہ حادثہ میرے لئے وہ وقت لایا کہ مجھے پیٹ بھرنے کے لئے بھیک مانگنی پڑی۔

کچھ دنوں تک گاؤں والوں نے مجھے بھیک نام پر بھی ایک دانہ تک دینا گوارہ نہ کیا کیونکہ ابھی میرے ظلم کے زخم ہرے تھے۔

لیکن پھر بھی خدا نے مجھ پر رحم کیا۔ اس نے گاؤں والوں کے دل میں رحم پیدا کیا۔ وہ لوگ مجھ اپاہج پر ترس کھا کر بھیک دینے لگے۔

پس جب سے روزانہ صبح سے شام تک ہاتھ پسارے بیٹھا رہتا ہوں اور نہ جانے کب تک یہ ہاتھ لوگوں کے سامنے پھیلے رہیں گے۔

لیکن بیٹا، مجھے ایک بات کا تجربہ ہو گیا کہ جو اس دنیا میں جیسا کرتا ہے، ویسا ہی بھرتا ہے۔

اپنی آپ بیتی ختم کرتے ہوئے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور ماضی کے گناہوں کے سیاہ سائے اس کی آنکھوں کے سامنے اس قدر بھیانک شکل میں رقص کرنے لگے کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

میں نے اس کے شانہ پر ہاتھ رکھا جو اس کے لئے مرہم ثابت ہوا۔

اس نے اپنے آنسوؤں کو اپنی قمیض کے دامن سے، جو کہ کئی جگہ سے پیوند کی مرہونِ منّت تھی، خشک کیا اور بولا۔

بیٹا! میری زندگی مکمل عبرت ہے!!!

٭ ٭ ٭

ٹھوکر

سڑک کے کنارے ایک بوڑھا آدمی میلے اور پیوند لگے کپڑے پہنے سودا بیچا کرتا تھا۔ ان دنوں چونکہ مونگ پھلی کا موسم تھا، اس لئے وہ اس دن بھی مونگ پھلی لگائے بیٹھا تھا۔

اچانک قریب چار بجے ایک شکل وصورت سے شریف لگنے والا آدمی اس بڈھے کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا اور نہایت بدتمیزی کے لہجہ میں بولا۔

اَبے اُو بڈھے! اتنا جھوٹ بولتا ہے تو!! ابھی تک تو آہی رہا ہے پیسے دینے!!!

خیر، اب بول ـــ آج تو، پیسے دے گا یا نہیں؟

اگر آج بھی تو نے کوئی بہانہ بنانے کی کوشش کی تو میں تیرا خونچہ اٹھا کر پھینک دونگا ـــ سمجھے؟

بڈھے نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

بابوجی! میں کل ضرور ضرور آپ کو تھوڑے سے پیسے دے دونگا... آپ یقین کیجئے ـــ آپ.....!

ابے تو کیا دے گا۔ تو تو روز ہی کوئی نہ کوئی رونا رو دیتا ہے۔

نہیں بابوجی.... آپ یقین رکھیں، میں کل ضرور کچھ نہ کچھ دے دوں گا۔

کیا کروں بابوجی، اُدھر کچھ مجھ پر پریشانیوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں کہ میں کچھ بتا نہیں سکتا۔ پس بابوجی، اسی وجہ سے دیر ہوگئی۔

بڈھے نے بڑی انکساری سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

نہیں ـــ میں یہاں بکواس سننے نہیں آیا ہوں۔ میں ابھی، اِسی وقت پیسے لونگا۔

یہ کہتے ہوئے اس نے ڈلیا کے ایک کونے کی تلاشی لینا شروع کردی۔

بابوجی! میرے گھر میں فاقہ ہوجائے گا مجھ پر مہربانی کیجئے۔ نہیں تو ہم لوگ بھوکوں مرجائیں گے۔ میں اپنی اولاد کی قسم کھاتا ہوں۔ تھوڑا تھوڑا کرکے سارا پیسہ چکتا کردوں گا۔

اس نے اپنی پونجی پر ہاتھ رکھ کر اپنی بے بسی اور مجبوری ظاہر کرتے ہوئے خوشامد کی۔

بابوجی کا چہرہ نرم نہیں بلکہ غصّہ کی شدّت سے سخت اور سُرخ ہوگیا۔ وہ بڈھے کو بھوکے شیر کی طرح گھور رہا تھا اور بڈھا بھیگی بلّی کی طرح نظریں جھکائے درخواست کر رہا تھا۔

اتنی ہی دیر میں راہ چلنے والے بہت سے لوگ اس طرح آکر کھڑے ہوگئے جیسے کوئی تماشا ہو رہا ہو۔ اب دونوں ہی نے لوگوں کو اپنی اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش شروع کردی۔

بابو جی اس کو جھوٹا اور بے ایمان ثابت کرنے میں سارا زور لگا رہے تھے جبکہ بڈھا صرف اپنی مجبوری ہی بیان کر رہا تھا۔

لیکن کوئی بھی شخص ان دونوں کے بیچ صلح کرانے کی کوشش میں آگے نہیں بڑھا۔

بابو جی چند منٹ کھڑے رہے پھر اس کی آنکھیں لال پیلی ہونے لگیں اور وہ یہ کہتے ہوئے ــــ 'تو تو' آج پیسے نہیں دے گا!' ــــ اس کی مونگ پھلی کی 'ڈلیا' پر ایک بھرپور 'ٹھوکر' مار کر سائیکل پر سوار ہو آگے بڑھ گیا اور لوگ دیکھتے ہی رہے!

کچھ دیر کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ وہ بابو جی آگے جا کر ایک ٹرک سے ٹکرا کر دور جا گرے۔

اس کی سائیکل چکنا چور ہو کر اس طرح بکھر گئی جیسے اب سے کچھ دیر پہلے اس غریب بڈھے کی مونگ پھلی کے دانے بکھر کر ساری سڑک پر پھیل گئے تھے۔

وہ خون سے لت پت تھا اور درد سے کراہ رہا تھا۔

کچھ لوگ اس کو اٹھانے میں لگے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ کھڑے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اور کچھ لوگ کہہ رہے تھے۔

کسی غریب کا دل نہیں دکھانا چاہیئے!

دل سے نکلی بد دعا اثر رکھتی ہے!!

کسی کی آہ نہیں لینا چاہیئے!!!

⁂

لال پانی

برات آ چکی تھی، نکاح ہو چکا تھا۔ اب ایک وسیع میدان میں کھانا کھلانے کی تیاریاں ہونے لگیں ــــ لوگ کرسیوں پر بیٹھ رہے تھے کہ سڑک پر ایک یکہ آ کر رکا اور اس سے ایک بوڑھی سواری اتری۔

اس کے پاؤں میں پلاسٹک کی چپل تھی جس کے پٹے کئی جگہ سے موچی کی اعلیٰ کاری گری کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ چپل کے ساتھ ساتھ پیر بھی گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ کمر پر پاجامہ لٹک رہا تھا مگر میلے رنگ کا ــــ یہ اس کا اپنا رنگ نہیں تھا بلکہ وقت کی دھوپ چھاؤں سے اس کی جلد کی طرح اس کے پاجامہ کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔ بدن پر قمیض اور اس پر سفید کھادی کی صدری تھی جو گرد کھاتے کھاتے سیاہ مائل ہو گئی تھی۔

بال کچھ سفید، کچھ کالے مگر سوکھے میلے اور بے ترتیب الجھے ہوئے تھے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ دیدے اندر کی طرف دھنسے ہوئے تھے۔ چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔

اس کی نگاہیں کچھ تلاش کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔ اس نے ماحول

کا بھرپور جائزہ لیا اور اس کے قدم دعوت گاہ کی طرف بڑھنے لگے۔ لوگ اس کو اپنی طرف آتا دیکھ کر اس طرح راستہ چھوڑنے لگے جیسے کوئی زہریلا ناگ اُن کو ڈسنے کے لئے ان کی طرف لپک رہا ہو۔

مہمان کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ صرف ایک کونے میں ایک کرسی خالی پڑی تھی۔ وہ بھی شاید اس لئے کہ اس کی، چولیں ڈھیلی تھیں۔ وہ غریب مہمان اسی کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا اور کھانا کھانے لگا۔

اسی اثناء میں ایک خوبرو جوان وارد ہوا۔ اس کا قیمتی اور خوبصورت سوٹ اس کی کار کے رنگ سے میل کھا رہا تھا۔

وہ بہت جلدی میں تھا۔ وہ جلد سے جلد کھانا کھانے کی زحمت سے چھٹکارا پانا چاہ رہا تھا ـــــ لیکن تمام کرسیاں پہلے ہی سے پُر تھیں۔

وہ لیک انتظام کار کے پاس گیا اور آہستہ سے کچھ کہا۔ اِس پر اُس انتظام کار کی نگاہیں اِدھر اُدھر سرچ لائٹ کی طرح گھومنے لگیں اور اس طرح اس بوڑھے مہمان پر آکر رُک گئیں جیسے وہ غیر قانونی طور پر سرحد پھاند کر کسی ملک میں گھس آیا ہو۔

ایں! یہ بڈھا کون ہے؟ یہ کہاں سے گھس آیا؟؟

زیرِ لب کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

"اَبے تو یہاں کیسے بیٹھ گیا۔ چل باہر" ـــ ابھی کھانا بھجواتا ہوں۔ نہ جانے کمبخت کہاں سے چلے آتے ہیں۔ چل اُٹھ شرافت سے اُٹھ جا۔ نہیں تو ابھی ٹھوکر

مار کر اٹھاؤں گا۔"

بڈھا حیرت سے اس کا منہ تک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ماجرا ہے؟ ابھی وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ انتظام کار اس پر پھر برس پڑا۔

اَبے جائے گا یا نہیں، یا بتاؤں؟؟ بے شرم کہیں کا ـــ اوقات زمین کی، بیٹھا ہے کرسی پر۔ چل باہر جا کر لائن لگا۔

اس کی یہ بے عزتی دیکھ کر، میرا دل پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

میں حیرت میں تھا کہ یہ کیسی مہمان نوازی ہے۔ یہ کیسا سلوک ہے۔ یہ سلوک تو کسی بھکاری کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن یہ تو فقیر نہیں ہے۔ قطعی نہیں ہے۔

اگر بھکاری ہوتا تو اس کی اِتنے بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کی ہمت نہ پڑتی۔ یہ مہمان ہے۔ یقیناً مہمان ہے۔ البتہ غریب ہے۔ اس کے رشتے داروں نے شادی میں بلانے کو بلا تو لیا لیکن کسی نے معمولی طور سے بھی خیر مقدم نہیں کیا۔

ابھی میں اس کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ میرے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی ـــ یا خدا! ایک صرف ایک لمحہ کے لئے کچھ لوگوں کے اس پر کان کھڑے ہوئے، نگاہیں اٹھیں اور دماغ نے سوال کیا کہ کیا ہوا؟

یہ لمحہ بیتتے ہی پھر سب اپنے اپنے کام میں مشغول ہو گئے ـــ کھانے میں باتیں کرنے میں، استقبال کرنے میں۔ لیکن میرا دل نہ مانا۔ میں باہر کی طرف لپکا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے سڑک پر وہ بوڑھا مہمان منہ کے بل گرا پڑا ہے اور

اس کی ناک سے خون بہہ رہا ہے۔

میں ایک کراس کے قریب پہنچا اور بہتا ہوا خون دیکھ کر بے ساختہ میری زبان سے نکلا:

کتنے ظالم لوگ ہیں۔ اس کا اتنا خون بہہ گیا۔ لیکن اس کو کسی نے اٹھایا تک نہیں۔ جیسے اس کا خون، خون نہیں ــــ لال پانی ہے۔

بڈھے نے درد سے کراتے ہوئے کہا:

ہاں بیٹا! میرا خون خون نہیں، لال پانی ہے۔ آج جس طرح مجھ بڈھے کو کسی جوان نے دھکا دیکر گرایا ہے۔ کبھی میں بھی جوانی کے نشے میں اپنے سے کمزوروں کو ایک ہی ہاتھ میں گرا دیا کرتا تھا۔ کبھی میں بھی کسی کے خون کو خون نہیں، لال پانی سمجھتا تھا۔

سچ تو یہ ہے بیٹا۔ آج مجھے شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ آدمی کو خدا کی دی ہوئی طاقت کا بے جا استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔!

نافرمانی کا نتیجہ

کسی گاؤں میں ایک بکری رہتی تھی۔ اس کے تین بچے تھے۔ بکری اپنے بچوں سمیت پاس کے گھنے جنگل میں چلی جاتی، سارا دن جنگل میں چرا کرتی، اور سورج ڈوبنے سے پہلے گھر لوٹ آتی۔

اس طرح زندگی کے دن خوشی خوشی گزار رہی تھی۔ بکری خوش تھی کہ وہ تین ننھے منے اور خوبصورت پھول جیسے بچوں کی ماں ہے۔ بچے خوش تھے کہ ان کی ماں کتنی پیاری اور رحمدل تھی۔ اپنے بچوں سے کتنا پیار کرتی تھی ــــ سارا دن اپنے بچوں کو ساتھ لئے پھرتی، انھیں کھلاتی پلاتی، ان کی دیکھ بھال کرتی، انھیں ساتھ لے کر گھر لوٹتی ــــ اور پھر ساری رات ان کی نگرانی کرتی اور ان کی ہلکی سی آواز سن کر تڑپ اٹھتی!

بکری بڑے چین و آرام کی زندگی گزار رہی تھی۔ نہ کسی بات کا غم، نہ کسی بات کی فکر! البتہ وہ اپنے ایک بچے کی لاپروائی اور نافرمانی سے کبھی کبھی دکھی ہو جایا کرتی تھی۔ وہ بچہ ماں کو بہت پیارا تھا۔ شاید سب بچوں سے زیادہ پیارا۔ اور اسی لاڈ و پیار نے اسے کچھ شوخ، شریر اور نٹ کھٹ بنا ڈالا تھا۔

وہ بچہ گھر سے اپنی ماں اور دوسرے بہن بھائی کے ساتھ ہی جنگل کی طرف روانہ ہوتا، مگر جنگل قریب آتے ہی سبھوں کو چھوڑ کر چھلتا، کودتا، چھلانگیں لگاتا جنگل میں دور تک گھستا چلا جاتا۔ ماں چیختی چلاتی، بھائی بہن پکارتے آوازیں دیتے مگر وہ سنی ان سنی کرتا ہوا بھاگ کھڑا ہوتا۔

بچے کی اس حرکت پر ماں بہت کڑھتی۔ اس کی آنکھوں میں خطرات گھومنے لگتے۔ وہ اکثر بچے کو بڑے پیار سے سمجھاتی اور اس حرکت سے باز آنے کی نصیحت کرتی۔ وہ اسے بتاتی کہ جنگل میں اس کا تنہا اتنی دور تک گھس پڑنا خطرے سے خالی نہیں اس لئے کہ اس گھنے جنگل میں کئی خطرناک جانور بھی رہتے ہیں۔ یہاں شیر، بھیڑیئے اور لومڑی جیسے جانور بھی بستے ہیں جو کبھی بھی اسے اپنا نوالہ بنا سکتے ہیں۔ مگر اس شریر بچے پر ماں کی نصیحتوں نے کبھی کوئی اثر نہیں ڈالا۔ ماں تھک ہار کر خاموش ہو گئی۔ مگر انجام کو سوچ سوچ کر ڈرتی رہی، گھبراتی رہی!

ہر روز کی طرح ایک صبح ماں اپنے بچوں سمیت جنگل کی جانب چلی، اور ہر روز کی طرح وہ شریر بچہ جنگل قریب آتے ہی ماں کو چھوڑ کر چھلانگیں لگاتا ہوا جنگل میں گھس پڑا اور من کی موج میں آگے بڑھتا ہی چلا گیا۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے اور خطرات کا اندازہ کرتے ہوئے۔

اور پھر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا اور غریب ماں کو جس بات کا ڈر تھا۔

اس جنگل میں ایک بڑے درخت کے سائے میں ایک بھوکی لومڑی اپنے کسی شکار کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ بکری کے اس نرم اور خوبصورت بچے کو دیکھتے ہی اس کی رال ٹپکنے لگی۔ فوراً اپنی جگہ سے اٹھی اور اپنے شکار پر جھپٹ پڑی۔ اور اپنے نوکیلے دانتوں میں دبائے اسے درخت کے نیچے لے آئی۔ بچہ بے بس ہو کر رہ گیا۔ اپنی ساری شرارت بھول بیٹھا۔ اب جبکہ موت اس کے سامنے تھی اسے اپنی ماں کی نصیحتیں اور خطرات سے ڈرانا رہ رہ کر یاد آ رہا تھا مگر اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ اب وقت نکل چکا تھا۔

اِدھر ممتا کی ماری ماں اپنے لال کو اِدھر اُدھر ڈھونڈتی پھری، روتی پھری،

چلاتی پھری۔ مگر کہیں کچھ پتہ نہ چل سکا۔

دوسری جانب لومڑی کی لپلپاتی ہوئی تیز نگاہیں بچے کو کھائے جا رہی تھیں۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اب وہ کوئی دم کا مہمان ہے۔ موت اور زندگی کے درمیان چند لمحوں کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

لیکن مصیبت میں ہمیشہ خدا یاد آتا ہے۔ جب کوئی سہارا نہیں ہوتا تو اللہ کا سہارا ہوتا ہے۔ اب بچہ بھی اپنی ساری شرارت بھول کر بس اللہ کو یاد کر رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے پیدا کرنے والے، اپنے پروردگار اور پالنہار سے کہہ رہا تھا کہ اسے اپنی نادانی اور شرارت کی کافی سزا مل چکی۔ ماں کی نافرمانی کا مزہ چکھ چکا۔ اب وہ معافی چاہتا ہے، توبہ کرتا ہے، آئندہ وہ اپنی ماں کی کہی ہوئی بات مانے گا۔ اپنی ماں کی نافرمانی کبھی نہیں کرے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اس کمسن بچے کی دعا سن لی اور توبہ قبول کر لی۔ اس لئے کہ اللہ اپنی مخلوق پر بڑا مہربان ہے اور جو کوئی سچے دل سے توبہ کرتا اور معافی مانگتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے معاف کر کے اپنی پناہ میں لے لیتا ہے!

چنانچہ فوراً جنگل کے بادشاہ شیر کو حکم ملا کہ جنگل میں فلاں مقام پر فلاں درخت کا رخ کرے۔ حکم خداوندی کے مطابق شیر اسی طرف کو چل پڑا اور جیسے لالچی لومڑی نے بچے کو دبوچنا چاہا، شیر دھاڑا اور اس کی گونج سے سارا جنگل دہل اٹھا۔ سارے جانور بدحواس ہو گئے۔ لومڑی جو ابھی چند منٹ پہلے بچے کو پھاڑ کھانے کا ارادہ کر رہی تھی۔ اب شیر کے ذریعہ پھاڑ کھائے جانے کے خیال سے تھرا اٹھی۔ جو لومڑی ابھی بچے کے لئے موت کا سامان بن رہی تھی، شیر کو کچھ ہی دور پر اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر اپنی موت کا یقین کر بیٹھی۔ اب اسے بچے پر

چھپنے اور اسے اپنا لقمہ تر بنانے کا ہوش کہاں تھا۔ وہ تو اب خود خونخوار شیر کے پنجے سے بچنے کا راستہ سوچ رہی تھی۔

اب لومڑی کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ چپکے سے دُم دبا کے رفوچکر ہو جائے ۔۔ اور جیسے ہی لومڑی نے شیر کی آنکھ بچاکر بھاگنا چاہا شیر نے ایک جست لگائی اور لومڑی کو اپنے مضبوط جبڑوں دبالیا۔

اُدھر شیر نے لومڑی کو دبوچا، اِدھر بکری کا بچہ موقع پاکر بھاگ کھڑا ہوا۔

وہ بھاگتا جاتا اور ماں ماں پکارتا جاتا۔ اور کافی دور بھاگنے کے بعد دکھیاری ماں نے اپنے کھوئے لاڈلے کی آواز پر آواز لگائی ۔ اور پھر ماں بیٹے تیزی کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دوڑے ۔ اور اس کے بعد بچہ اپنی ماں کے سینے سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ماں نے بھی اپنے لاڈلے کو سینے سے لگاکر بھینچ لیا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ دونوں جدائی کے بعد اس اچانک ملاپ پر رو رہے تھے۔ مگر یہ آنسو غم کے نہیں تھے۔ شکر کے تھے!

بھائی بہن نے بھی اپنے چہیتے کو سینے سے لگالیا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

پھر بچے نے ماں سے وعدہ کیا کہ وہ اپنی ماں کی ہر بات مانے گا۔ اب کبھی نافرمانی نہیں کرے گا!

ماں بھی اپنے جگر کے ٹکڑے کی بخیریت واپسی اور سیدھی راہ اختیار کرنے پر اللہ کا شکر بجالائی!

سورج ڈوبنے سے پہلے ماں بیٹے بہن خوش خوش گھر لوٹ آئے!

❖

بدر عظیم آبادی

ہر سیٹ پلاسٹک بیگ میں

پیارے بچوں کے لئے پیاری دلچسپ اور بامقصد کہانیاں

پہلا سیٹ ۵ کتابیں ۷/۰
- سونے کا پہاڑ ۱/۴۰
- بھلے کی بھلائی ۱/۴۰
- سڑک کا بادشاہ ۱/۴۰
- حلوہ ۱/۴۰
- اندھا سانپ ۱/۴۰

دوسرا سیٹ ۵ کتابیں ۶/۰
- احمق میاں ۱/۲۰
- نقلی نوٹ ۱/۲۰
- ہائے ہائے ۱/۲۰
- رنگیلا بادشاہ ۱/۲۰
- ٹرکی کے لڈے ۱/۲۰

تیسرا سیٹ ۶ کتابیں [illegible]
- معصوم مجرم ۱/۵۰
- بادشاہ کا خواب ۱/۵۰
- بچے شاہ ۱/۵۰
- انصاف ۱/۵۰
- شکستہ بادشاہ ۱/۵۰

چوتھا سیٹ ۵ کتابیں ۸/۰
- اندھی فیروزی ۱/۶۰
- نئی روشنی ۱/۶۰
- بے وقوف بادشاہ ۱/۶۰
- توبہ ۱/۶۰
- وعدہ ۱/۶۰

پانچواں سیٹ ۵ کتابیں [illegible]
- شہزادہ [illegible] ۲/۰
- انقلاب ۱/۶۰
- کعبہ میرے آگے ۲/۰
- جنت کا شہزادہ ۱/۷۵
- آسیبی مکان ۱/۲۰

چھٹا سیٹ ۶ کتابیں ۱۱/۵۰
- انسان کی کہانی ۲/۵۰
- ہیروں کی چوری ۱/۶۰
- ننھے بچے ۱/۶۰
- ٹوپی چوری ۱/۶۰
- چھوٹے میاں [illegible]
- خانہ بدوشوں کا ڈیرہ [illegible]

ساتواں سیٹ ۵ کتابیں ۸/۸۰
- اللہ کی مدد ۱/۶۰
- خاموش تبلیغ ۱/۶۰
- سفارش ۱/۶۰
- خدا کی خدائی ۲/۰
- ہاتھی کے دانت ۲/۰

آٹھواں سیٹ ۳ کتابیں [illegible]
- خوفناک دھماکہ ۲/۰
- خطرناک سازش ۲/۰
- حسن کے کارنامے ۲/۵۰

نواں سیٹ ۳ کتابیں ۹/۵۰
- ٹوٹی گڑیا کے بھوت ۳/۵۰
- تصویر اور تحریر ۳/۵۰
- بھاگتا سایہ ۳/۵۰

دسواں سیٹ ۳ کتابیں ۱۲/۰
- آخری خواہش ۲/۰
- نورانی وصیت ۲/۵۰
- سرخ تجوری ۳/۰

گیارہواں سیٹ [illegible]
- مرغے کا سالن ۱/۷۵
- بچی کا بیان ۱/۷۵
- عید کا تحفہ ۱/۷۵
- شہزادی کی [illegible] ۳/۰

بارہواں سیٹ ۶ کتابیں ۱۰/۸
- زندہ درگور ۱/۷۵
- ننھا شاہد ۱/۷۵
- دوست کے نام ۱/۷۵
- چاچا جی کا انجام ۱/۷۵
- بہت مردوں ۳/۰

تیرھواں سیٹ [illegible]
- جادو ۱/۷۵
- دو سہیلیاں ۱/۷۵
- ہاتھی کا بچہ ۱/۷۵
- آدمی ہی بڑا ہے ۳/۵۰

مکتبہ [illegible]